تعلیماتِ اقبال کا عہد حاضر میں اطلاق

(Application of Iqbal's Teachings in the Present Era)

DOI: https://doi.org/10.54692/nooretahqeeq.2023.07042079

ڈاکٹر خضریٰ تبسم
Dr. Khizta Tabassum
Assistant Professor, Department of Urdu
Lahore College for Women University, Lahore

ڈاکٹر ثوبیہ منظور
Dr. Sobia Manzoor
Visiting Lecturer (Urdu)
Punjab University, IER, Lahore

Abstract:

Allama Iqbal's teachings are not specific to a particular time, a particular region or a particular race. Iqbal is a poet of every age. He guides the individual in the right direction and to shape him morally and spiritually. This individual training leads to collective training for them. A nation, a country or a society can be built together with individuals having good inner and moral training. When Iqbal's theory of self flourishes, moves forward, grows in an individual, enlightens his moral and spiritual values, then this individual goes ahead and applies all his spiritual and moral values collectively. A human being can possess perfect qualities only when the idea of selfhood is present in it with all its characteristics, while on the other hand, the promotion of the idea of selfhood is possible in the same way if Iqbal's humanist man is aware of his position and at the time when he has achieved all the attributes in himself. Iqbal's 'Mard-e-Momin' uses his inner qualities according to his rank and ability and plays his role in the society. In other words, duties are assigned to each person according to his attributes and they are classified accordingly. In this paper, the teaching of Iqbal have been analysed regarding their application in the present era.

Keywords:
Allama Iqbal, Iqbal's theory, Iqbal's Teachings, Idea of Selfhood, Urdu Literature, Urdu Poetry, Urdu Prose.

علامہ اقبال کی تعلیمات کسی ایک خاص وقت، کسی خاص علاقے یا کسی خاص رنگ و نسل کے لیے مخصوص نہیں ہیں۔ اقبال ہر دور کے شاعر ہیں۔ ان کے افکار اور ان کی تعلیمات کا ایک جاندار پہلو یہ بھی ہے کہ وہ فرد کی درست سمت میں رہنمائی اور اس کی اخلاقی و روحانی تشکیل کرنے کے خواہاں ہیں۔ یہی انفرادی تربیت ان کے نزدیک اجتماعی تربیت کا باعث بنتی ہے۔ قوم، ملک یا معاشرہ افراد سے مل کر تعمیر پاتا ہے اور اگر فرداً فرداً قوم کے ہر شخص کی باطنی و اخلاقی تربیت عمدہ طور پر ہو گی تو آخر کار اس انفرادی تربیت کے اثرات اجتماعی شکل میں ظاہر ہونگے اور اس سے ایک مثالی معاشرہ تشکیل پائے گا۔ یہی اقبال کے خودی اور بے خودی کے نظریات ہیں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال رقم طراز ہیں:

> "اقبال کی نظر میں فرد اور جماعت مادی اور روحانی اعتبار سے ایک دوسرے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ افراد کی صلاحیتیں جماعت کو نکھارتی ہیں اور جماعت ان کی بے راہ روی کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر ان کی شخصیت میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہے۔ اس طرح جماعت کے مسائل کے حل کے لیے افراد میں اعلیٰ مقاصد اور ان کی تحصیل کی خاطر تگ و دو کی خواہش پیدا ہوتی ہے۔"(۱)

اقبال کی خودی کا نظریہ جب پنپتا ہے، آگے بڑھتا ہے ایک فرد میں نمو پاتا ہے، اپنی اخلاقی و روحانی قدروں سے روشناس کراتا ہے تو آگے جا کر یہی فرد اپنے تمام تر روحانی اور اخلاقی اقدار کا اطلاق اجتماعی طور پر کرتا ہے۔ اب یہاں سے بے خودی کی تعلیمات شروع ہو جاتی ہیں۔ بالفاظِ دیگر اقبال خودی پر اس لیے زور دیتے ہیں تاکہ اس کے نتائج بے خودی کی صورت میں بہتر طور پر حاصل ہو سکیں۔ گویا خودی تکمیل بے خودی کی پہلی کڑی ہے۔ اقبال کی تعلیمات کا دائرہ کار کسی خاص وقت تک محدود نہیں ہے۔ اقبال ہر دور کے شاعر و مفکر ہیں۔ ان کے نظریات حصولِ پاکستان کی ایک وجہ ضرور ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ اقبال کے خوابوں کے مطابق ایک الگ مسلم خطے کے قیام سے ان کی تعلیمات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ ایسا ہر گز نہیں ہے۔ تعلیماتِ اقبال کی کل بھی ضرورت تھی جب امتِ مسلمہ کا شیرازہ بکھر چکا تھا اور ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا اور آج بھی ضرورت ہے جب اس امتِ کو سازشوں کے عمیق ترین سائے گھیرے ہوئے ہیں۔ آج بھی اقبال کی تعلیمات، ان کے افکار، ان کی روحانی اور اخلاقی اقدار کی ترویج کی کوششوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو لامحالہ اس امر کی نشاندہی ہوتی ہے کہ عہدِ حاضر میں افکارِ اقبال کی تشریح و توضیح کی ضرورت بالکل اسی طرح ہے جیسا کہ آج سے نوے یا سو سال قبل تھی۔ گویا تعلیماتِ اقبال کا اطلاق محض اس خاص عہد کے لیے نہیں تھا جب مسلم معاشرہ

اپنے تشخص کے حصول کے لیے سر گرداں تھا بلکہ عہدِ حاضر میں اس تشخص کو بر قرار رکھنے کے لیے بھی ان کی سخت ضرورت ہے۔ اقبال کے تفکر کا بنیادی مرکز مردِ مومن ہے جو سراسر خودی سے روشناس ہو چکا ہے، اسی مردِ مومن کے گرد ان کے اکثر دیگر نظریات گھومتے ہیں۔ مثال کے طور پر اقبال کی خودی کا نظریہ، یہ نظریہ درحقیقت اقبال کے مردِ مومن کے لیے ہے اور مردِ مومن بھی اسی نظریہ کے ماتحت ہے گویا یہ دونوں ایک دوسرے میں باہم مربوط ہیں۔ مردِ مومن کامل اوصاف کا حامل تب ہی ہو سکتا ہے جب اس میں خودی کا نظریہ اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ موجود ہو گا جب کہ دوسری طرف خودی کے نظریے کی ترویج اسی طرح ممکن ہے اگر اقبال کا مردِ مومن اپنے مقام سے آگاہ ہو گا اور جس مرتبہ پر اسے فائز کیا گیا ہے وہ تمام تر وصف اپنے اندر سمو لینے کا اہل ہو گا۔ محمد عثمان، اقبال کے مردِ مومن کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> "وہ خدا کا ایک سپاہی ہے جو دنیا میں اس لیے آیا ہے کہ حق و صداقت کی حمایت کرے اور باطل قوتوں سے نبرد آزما ہے، وہ نیکی کا محافظ اور بدی کا دشمن ہے۔ اس کی تگ و دو کا مقصود یہ ہے کہ زندگی اپنے صحیح مقام سے آشنا ہو اور انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی حق و خیر کی راہ میں آگے بڑھے۔"(۲)

اقبال کے مردِ مومن کے نکتہ پر براجمان شخصیات کو بھی درجہ بدرجہ اہمیت حاصل ہے۔ ان کے نزدیک آنحضرت محمد ﷺ کی ذاتِ مبارکہ کے بعد خلفائے راشدین اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہیں ان کے بعد صحابہ کرام، اولیائے کرام، آئمہ دین اور علمائے کرام کو اہمیت حاصل ہے۔ گویا اقبال کا مردِ مومن اپنے اپنے مرتبہ اور اہلیت کے مطابق اپنے اندر کی خصوصیات کو بروئے کار لاتا ہے اور معاشرے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہر مردِ مومن کو اس کے اوصاف کے مطابق فرائض تفویض کیے گئے ہیں اور ان کی درجہ بندی بھی اسی لحاظ سے کی گئی ہے۔

اقبال کا نظریہ عشق بھی مردِ مومن سے منسلک ہے کیوں کہ مردِ مومن ہی اس مقام کے حصول کے لیے کوشاں ہے اور اسی کو ہی یہ مقام و رتبہ حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ جذبہ اقبال کے مردِ مومن کے لیے اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہی ایک جذبہ محرک ہے اس کائنات اور روز و شب کے سلسلے کے قیام میں، یہی وہ جذبہ ہے جو ایک اعلیٰ ترین انسان کو زمین سے عرش تک لے جاتا ہے۔ واقعہ معراج جہاں اقبال کے افکار میں ان کے زمان و مکان کے نظریہ کی نشاندہی اور وضاحت کے لیے بار بار مذکور ہے وہاں اس میں تسخیر کائنات کے جذبے کا اظہار بھی موجود ہے۔ واقعہ معراج تسخیرِ کائنات کا ثبوت ہے اور تسخیر کائنات مردِ مومن کی خاص صفت ہے جب کہ مردِ مومن اقبال کے نظریہ خودی سے مربوط ہے۔ گویا یہ تمام نظریات کڑیوں کی صورت میں ایک دوسرے سے منسلک ہیں۔ ان میں چند دیگر نظریات عشق، حسن، پیکار، علم، فطرت نگاری وغیرہ مندرجہ بالا تمام تر نظریات کی کڑیوں کو ایک دوسرے میں باہم مربوط کرنے کے مابین تعلق

استوار کرنے کا کام کرتے ہیں۔

بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو اس امر کا اظہار ہوتا ہے کہ اقبال نے تمام تر نظریات کو ایک دوسرے میں شعوری یا لاشعوری طور پر اس طرح منسلک کیا ہوا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی کڑی ٹوٹ جائے تو نہ ہی مردِ مومن اپنے مرتبے پر فائز رہ سکتا ہے اور نہ ہی اس مثالی معاشرے کا قیام عمل میں لایا جا سکتا ہے جس کے لیے اقبال تگ و دو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب اگر عہدِ حاضر میں اقبال کے افکار کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے لاشعور میں نہاں اس امر کا ادراک کیا جائے کہ اقبال ایک مثالی معاشرہ اور ایک مثالی انسان کے لیے اپنی تمام تر تعلیمات و افکار کا اظہار کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ عہدِ حاضر میں تو شاید اقبال کا خواب ٹوٹ کر بکھرتا دکھائی دیتا ہے۔ اقبال کے انسان کامل تو شاید کہیں خال خال ڈھونڈنے سے نظر آ بھی جائیں مگر وہ مثالی معاشرہ تو محض اس لیے قائم نہیں ہو سکتا کہ ان کی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ آج کا معاشرہ تباہی کے جس دھانے پر پہنچ چکا ہے۔ مغرب کی جس یلغار کے خلاف اقبال تمام عمر کمر بستہ رہے آج وہ یلغار ہمیں خس و خاک کی طرح بہائے لے جا رہی ہے۔ اقوام بنام اوطان کا زہر آج مسلم معاشرے کو ایک گھن کی طرح چاٹے جاتا ہے۔ دین سے دوری، خالصتاً ملایت کا فروغ، فرقہ پرستی سمیت مختلف عناصر نے شاید اقبال کے خواب کو چکنا چور کرنے کے قریب کر دیا ہے۔ اقبال کے نظریات کا اطلاق راقم الحروف کے خیال میں عہدِ حاضر پر بھی اسی طرح ہوتا ہے جیسا کہ عہدِ گزشتہ ہوتا تھا کیوں کہ ایک معاشرہ، ایک قوم تو قائم ہو گئی لیکن اس کی تربیت کے لیے اہم ترین عناصر کو نظر انداز کیا جا رہا ہے جو شاید تعلیمات اقبال جو کہ دراصل تعلیماتِ قرآنی کا ماخذ ہیں سے ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔

آج کا دور کمپیوٹر، ٹیکنالوجی اور سائنس کا دور ہے، مادی طور پر انسان ترقی کی کئی منازل طے کر چکا ہے، دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک رسائی حاصل کر چکا ہے، اس کی قوتِ تسخیر محض زمین تک محدود نہیں ہے بلکہ ستاروں اور سیاروں پر بھی اپنی کمندیں ڈال چکا ہے، علم کے شعبہ جات اور شاخیں وسعتوں کے باعث تقسیم در تقسیم ہو چکی ہیں، تحقیق کے شعبہ میں قابل قدر کارنامے انجام دیئے جا چکے ہیں، ایجادات کے شعبہ میں دنیا نت نئے اقدامات اور منازل طے کر رہی ہے۔ مادی طور پر انسان بہت مضبوط اور مستحکم ہو چکا ہے لیکن اخلاقی طور پر اسی قدر پست اور کمزور ہوتا جا رہا ہے، مادی ترقی کے باوجود عقلی اور اخلاقی طور پر آج کے انسان میں نہ تو عصبیت اور تعصب کے جراثیم ختم ہوئے ہیں اور نہ ہی اس کی عقلی حدود نے دوسرے انسانوں کو کم تر کرنے، کمزور کرنے اور شکست سے دوچار کرنے میں کوئی کمی کی ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ عہدِ حاضر میں جس قدر مادی استحکام حاصل ہوا ہے اس سے کئی گنا زیادہ اخلاقی پستی نے بھی انسان کو اندھیروں کی طرف دھکیل دیا ہے، اقبال مغرب کی جس تقلید اور اندھی پیروی سے روک رہے تھے آج اسی نے اس خطہ کے مسلمانوں کو بری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے، اقبال کے نزدیک روحانیت ہی بقائے انسانی کا واحد ذریعہ ہے، تقلیدِ غیر سے جہاں اپنی اخلاقی اقدار کا بیڑا غرق ہوتا ہے وہیں ایک ایسی تہذیب کی ترویج ہوتی ہے جو نہ صرف دینِ اسلام کے

سراسر منافی ہے بلکہ انسانی فطرت سے بھی کسی طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔ محض یہی وجہ ہے کہ اقبال یورپ کی اندھی تقلید کرنے والوں کو کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ ایسے نوجوان جو یورپ کی تقلید میں مشغول ہیں ان کے بارے میں اقبال کہتے ہیں:

ترا وجود سراپا تجلی افرنگ
کہ تو وہاں کے عمارت گروں کی ہے تعمیر
مگر یہ پیکر خاکی خودی سے ہے خالی
فقط نیام ہے تو، زرنگار و بے شمشیر(۳)

عہدِ حاضر میں امریکہ اور برطانیہ جیسی بڑی طاقتیں مسلم ممالک کو کہیں دہشت گردی کا نشانہ بنا کر تو کہیں حالات کی خرابی کا بہانہ بنا کر کچل رہی ہیں۔ عراق، فلسطین، لیبیا، افغانستان، اور پاکستان سمیت کئی ملکوں میں امریکہ اور اس کے حواری محض اس لیے ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں کہ ایک تو یہ ممالک مسلمان ہیں دوسرا ان میں اکثریت ایسے ممالک کی ہے جو دفاعی طور پر مستحکم نہیں ہیں، سوائے پاکستان کے کسی بھی دوسرے اسلامی ممالک کے ہاں نہ تو ایٹمی طاقت ہے اور نہ ہی اس قدر اہلیت ہے کہ وہ اپنے دفاع کا خاطر خواہ انتظام کر سکے۔ آج کے عہد میں بھی مسلمان زبوں حالی کا شکار ہیں، نہ تو ان کے حقوق کا خیال رکھنے کے لیے اتحاد ملت اسلامیہ کی کوئی سکیم یا پلان پیش نظر ہے اور نہ ہی کوئی اجتماعی دفاعی حکمت عملی ہے جس سے مسلم دنیا اپنا تحفظ حاصل کر سکے۔

دہشت گردی کے نام پر دوسرے ممالک میں پے در پے قتل عام، بم دھماکے، براہ راست حملے، سرحدوں کی خلاف ورزی، یہ تمام ایسے عوامل ہیں جو ان ممالک کو جو دراصل ابلیس کی جماعت کے کارندے ہیں، دہشت گرد ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ یہ محض عہد حاضر میں غیر مسلم ممالک کی امت مسلمہ کیخلاف کاروائیوں، ناروا سلوک اور بے دریغ حملوں کی چھوٹی سی نشاندہی ہے۔ حالات اس سے کہیں زیادہ دگرگوں ہیں۔

اقبال کے دور میں بھی مسلمان کسم پرسی کا شکار تھے۔ عرب ممالک میں ان دنوں بھی مختلف قوتیں برسرپیکار تھیں، ہندوستان پر تب بھی برطانیہ قابض تھا۔ طرابلس، شام، مصر اور دیگر مسلم ممالک کو تب بھی ظلم و ستم اور دہشت گردی کا نشانہ بنایا جاتا تھا، اس وقت بھی مسلمانوں کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا جاتا تھا اور آج بھی اس میں تبدیلی نہیں آئی۔ فقط مقامات، ممالک اور لوگ بدل گئے ہیں۔ نہ تو واقعات میں تبدیلی آئی ہے نہ ہی مسلم دنیا کی زبوں حالی اور کفار کی ستم ظریفی میں کوئی کمی آئی ہے۔ اقبال کے عہد میں جمعیت اقوام کے نام سے ادارہ قائم کیا گیا تھا اور آج اقوام متحدہ کے نام سے قائم ہے جس کا مقصد تمام دنیا کو یکساں حقوق کی فراہمی یقینی بنانا ہے مگر اس وقت بھی یہ "یکساں حقوق" محض طاقتور قوتوں کے اشارے پر دیئے جاتے تھے اور عہدِ حاضر میں بھی صورت حال اس سے چنداں مختلف نہیں ہے۔

عصرِ حاضر میں ملتِ اسلامیہ گوناگوں مسائل کا شکار ہے، چند مسلم ممالک دہشت گردی اور جبر واستبداد کا شکار ہیں تو دوسری جانب چند اسلامی ممالک بے خبری سے اپنی تعیش پسند زندگی گزار رہے ہیں۔ ان حالات میں اسلام دشمن قوتیں آہستہ آہستہ اسلام پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے اپنے پر پھیلا رہی ہیں۔ مسلم دنیامیں مختلف مقامات پر کئی اسلام دشمن قوتیں اپنی شر پسندیاں دکھارہی ہیں اور امت مسلمہ میں پھوٹ پیدا کر رہی ہیں۔

دینِ اسلام کے استحکام کے لیے جہاں ایک طرف اتحاد عالم اسلام ضروری ہے وہاں فرقہ واریت کے خاتمہ سمیت تمام ایسے مسائل کا خاتمہ بھی ضروری ہے جو اتحاد عالم اسلام کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہیں۔ فرقہ واریت کا خاتمہ کیے بغیر نہ تو اسلام مستحکم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اقوام عالم کی سازشوں کا جواب دینے کا اہل ہو سکتا ہے۔ دینِ اسلام کے استحکام کے لیے ضروری ہے کہ اقوام عالم پر اسلام کے تشخص کو بہتر طور پر سامنے لایا جائے اور ایک پر امن دین کے طور پر متعارف کرایا جائے جو کہ اسلام کی اصل ہے۔ اسلام دشمن قوتیں گزشتہ دو دہائیوں سے مسلسل اسلام کو محض ایک دہشت گرد، انتہا پسند اور تنگ نظر و قدامت پسند دین ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہیں جب کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اسلام ایک روشن خیال، وسعت پسند اور پر امن دین ہے، محض سازشوں کا جال بچھا کر اسلام کا تشخص خراب کرنے کی مساعی کی جارہی ہیں۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اسلام کے تشخص کو بہتر کیا جائے۔ اقوام عالم کو باور کرایا جائے کہ اسلام ایک صلح پسند اور روشن خیال دین ہے جس میں عورت کو اس کے مکمل حقوق حاصل ہیں۔ غرباء اور یتیموں اور مساکین کا استحصال نہیں کیا جاتا اور اقلیتوں کو مکمل تحفظ دیا جاتا ہے جو دنیا کے کسی بھی مذہب میں نہیں دیا جاتا۔ دنیا کے کسی بھی مذہب سے اسلامی اقدار کا موازنہ کیا جائے تو بہر صورت اسلام ایک مکمل اور بہترین دین کے طور پر سامنے آتا ہے

عہدِ حاضر کے تقاضوں میں سے ایک اہم ترین تقاضا یہ ہے کہ اسلامی ممالک کی معیشت کی بہتری کے لیے اقدامات کیے جائیں۔ غیر مسلم قوتیں عالمی منڈی پر اپنا تسلط قائم کرنے میں لگی ہوئی ہیں۔ ایسے اسلامی ممالک جو معاشی طور پر مستحکم ہیں ان کو فنی طور پر اس قدر کمزور اور تعیش پرست کر دیا گیا ہے کہ وہ اپنی معیشت کی بقا کے لیے دوسروں پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں مثال کے طور پر بعض عرب ممالک۔ یہ ممالک عالمی منڈی میں ایک مضبوط ترین معیشت ہونے کے باوجود دوسروں کے دست نگر ہیں۔ اسلام نے سود کا خاتمہ کر دیا لیکن عالمی بینک غریب ممالک کو قرض کے شکنجوں میں جکڑ کر سود در سود اپنے بینکاری کے نظام کے ذریعہ غریب سے غریب تر کرتے چلے جارہے ہیں، اس سود سے ان غریب ممالک کے لیے چھٹکارا حاصل کرنا بھی امر محال بنتا جارہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے سود سے پاک معاشی نظام کو ترجیح دی ہے لیکن اسلام دشمن قوتوں نے قرضوں اور سود کے شکنجوں میں جکڑ کر اسلامی ممالک کو کمزور کرنے کی سازشیں قائم کی ہوئی ہیں جس سے چھٹکارا پانا آسان نہیں ہے۔ ان معاشی کمزوریوں کو دور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ تمام مسلم

دنیا ایک دوسرے پر انحصار کرے نہ کہ غیر مسلم دنیا پر۔ تمام مسلم ممالک ایک دوسرے کی فنی قوتوں سے استفادہ کرے تاکہ مستقبل میں معاشی طور پر غلبہ حاصل کر سکیں اور اسلام دشمن قوتوں کے عزائم خاک میں ملا سکیں۔

معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ دفاعی استحکام نہایت ضروری ہے، دفاعی نکتہ نظر سے دیکھا جائے تو اقوامِ عالم میں فقط پاکستان وہ اسلامی ملک ہے جو ایٹمی طاقت کا حامل ہے ورنہ تمام تر اسلامی ممالک دفاعی استحکام کے لیے غیر مسلموں کے سامنے سرنگوں ہیں۔ اس کے برعکس کئی غیر مسلم قوتیں مثال کے طور پر امریکہ، برطانیہ، روس، فرانس، اسرائیل، جرمنی وغیرہ سمیت کئی دیگر ممالک کو بھی ایٹمی قوت حاصل ہے اور دفاعی طور پر مضبوط ہو رہے ہیں۔ عہدِ حاضر میں جہاں دینِ اسلام کی مضبوطی، اتحادِ عالم اسلام، بہتر تشخص اور معاشی استحکام کی ضرورت ہے وہاں دفاعی طور پر بھی عالم اسلام کو مضبوط کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کے بغیر عالم اسلام کی جڑیں کمزور ہوتی جائیں گی اور وقت کے ساتھ ساتھ اس کا انحصار غیر مسلم قوتوں پر بڑھتا جائے گا جو کہ اقبال کے تصورات کے بالکل مخالف ہے۔

گزشتہ چند دہائیوں میں مسلم ممالک نے فنی، سائنسی اور علمی نکتہ نگاہ سے قدرے ترقی ضرور کی ہے لیکن یہ ترقی غیر مسلم قوتوں کے مقابلے میں کئی درجہ کم ہے۔ سائنسی و فنی علوم جو کہ خالصتاً مسلمان سائنس دانوں کے مرہونِ منت ہیں، ریاضی، الجبرا، کیمیا، طبیعات، جغرافیہ، فنون لطیفہ اور دیگر اہم ترین مضامین جو آج وقت کی اہم ترین ضرورت ہیں، حقیقت میں ان کی اساس، ان کی ابتدا اور ارتقا کا سہرا مسلمانوں کے سر ہے لیکن عہدِ حاضر میں ان تمام علوم سے غیر مسلم قوتیں استفادہ کر رہی ہیں۔ خطاب بہ جوانانِ اسلام میں اقبال اسی چیز کا رونا روتے ہیں:

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمین پر آسماں نے ہم کو دے مارا
وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا(۴)

باالفاظِ دیگر مسلم مفکرین و سائنس دانوں نے جو کارہائے نمایاں نشاۃ اول میں انجام دیئے، نشاۃ ثانیہ میں تحقیق کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اخذ شدہ نتائج پر انحصار ہونے لگا جس سے جمود کی فضا طاری ہو گئی۔ یہ جمود محض علمی نہیں تھا بلکہ اس کے اثرات روحانیت، معیشت، زراعت، فنون لطیفہ سمیت ہر شعبہ ہائے حیات پر پڑے۔ یوں مسلمان زبوں حالی کا شکار ہوتے گئے۔ اس کے برعکس غیر مسلم قوتوں نے تحقیق، فن، معیشت، فنونِ لطیفہ سمیت زندگی کے تمام شعبوں میں ترقی کی اور مسلمانوں کے علمی اثاثے سے بطورِ خاص استفادہ کیا جس سے ہر شعبہ ہائے حیات میں وہ مسلمان قوم کو پیچھے چھوڑ گئے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

"بقول اقبال مسلمان سائنس کے موجد تھے۔ انحطاط کے سبب جب وہ غفلت کی نیند سو

گئے تو یورپ نے انہی کے وضع کردہ مشاہداتی یا تجرباتی اصولوں پر چلتے ہوئے سائنس اور ٹیکنالوجی میں نمایاں ترقیاں حاصل کیں آج اگر مسلمان سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب سے رہبری حاصل کرتے ہوئے انھیں اپنے معاشروں میں رائج کرتے ہیں تو بقول اقبال وہ کسی غیر اسلامی تمدن کی اقدار نہیں اپنا رہے بلکہ مغرب سے وہی کچھ واپس لے رہے ہیں جو ایک مرحلے پر خود ہی انھوں نے مغرب کو دیا تھا۔"(۵)

اقبال نے جنوری ۱۹۰۳ء کے ماہانہ مخزن میں "بچوں کی تعلیم و تربیت" کے عنوان سے مضمون لکھا تھا۔ اس مضمون میں طلبا کی بنیادی تعلیم، ان کے طبعی میلان و استعداد، قوائے ذہنیہ کی بہتری، اضطراری حرکات کا میلان، قوائے عقلیہ کی عدم یکسوئی، قوتِ متخلیہ یا واہمہ کی کثرت، قوتِ ممیزہ کا کمزور ہونا اور حافظے میں تیزی جیسے عوامل پر زور دیا گیا ہے، اگرچہ یہ اقبال کے فلسفہ تعلیم کا مکمل غماز نہیں ہے اور اس میں محض بچوں کی تربیت کے حوالے سے چند اصول متعین کیے گئے ہیں تاہم یہ مضمون اس امر کا ثبوت ضرور ہے کہ اقبال ابتدا ہی سے تعلیم و تربیت کے متعلق ایک خاص رائے رکھتے تھے، اگرچہ ان کی رائے میں بتدریج تبدیلی آئی اور بالآخر ان کے بکھرے ہوئے تعلیمی افکار کو سمیٹ کر ایک مدرسہ تعلیم کی بنیاد ضرور رکھی جاسکتی ہے۔ اقبال کے نظریہ تعلیم کی مماثلت ان کے نظریہ حیات سے بہت زیادہ پائی جاتی ہے۔ جو اقبال کا نظریہ حیات ہے دراصل وہی ان کا نظریہ تعلیم ہے۔ اقبال زندگی کے ہر پہلو میں ارتقا کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک یہی ارتقائی کیفیت زندگی کو رواں دواں رکھے ہوئے ہے اور کچھ ایسی ہی صورت حال ان کے نظریہ تعلیم میں پائی جاتی ہے۔

اقبال کے مقاصد تعلیم کی طرف نظر دوڑائی جائے تو واضح طور پر اقبال ایک مصلح کے روپ میں سامنے آتے ہیں۔ اقبال کی خودی جو کہ ان کی فکر و استدلال کا بنیادی نکتہ ہے، اسی کے گرد اقبال کے تمام نظریات گھومتے ہیں۔ دیگر تمام نظریات کی ماہیت اور ان کا خمیر اسی ایک نکتہ خودی سے بنایا گیا ہے۔ اقبال کے نظریہ تعلیم پر بھی خودی و بے خودی یا اجتماعی خودی کے اثرات دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک تعلیم کا اہم ترین مقصد تربیتِ خودی ہے اس کے بعد خودی اور بے خودی کا تحفظ اور ان کے درمیان تسلسل کا قائم کرنا ہے۔ ان کی افزائش کرنا اور ان میں توازن رکھنا بھی تعلیم ہی کا مقصد ہے۔ محمد احمد خان نے اپنی تصنیف "اقبال اور مسئلہ تعلیم" میں تعلیم کے تین بنیادی مقاصد بیان کیے ہیں:

۱۔ انفرادی خودی کی بیداری و استحکام
۲۔ اجتماعی خودی یا قومی انا کا تسلسل و تحفظ
۳۔ انفرادی خودی اور اجتماعی خودی یعنی فرد کی انا اور قومی انا میں توازن کی افزایش اور ان میں ہم آہنگی کا فروغ(۶)

مندرجہ بالا تینوں مقاصد کا بغور جائزہ لیا جائے تو واضح دکھائی دیتا ہے کہ اقبال کے مقاصد تعلیم دراصل وہی ہیں جو خودی کے بنیادی نکات ہیں۔ اقبال انفرادیت سے اجتماعیت کی طرف بڑھنے کے قائل ہیں۔ اس لیے ایک فرد کی تربیت پر مکمل توجہ دے کر اسے تعلیم دے کر پورے معاشرے کی تعلیم و تربیت کرنے کے خواہاں ہیں۔ گویا خودی اور بے خودی کا جو تسلسل اور ارتقا ان کی فکر میں موجود ہے وہی ارتقا اور تفکر ان کے نظریہ تعلیم میں بھی کار فرما ہے اور اسی کی بنیاد پر وہ مقاصد تعلیم بھی متعین کرتے ہیں۔ اقبال نے ایک اور اعلیٰ کام یہ کیا ہے کہ انھوں نے مغرب و مشرق کے تعلیمی نظام کے مطالعہ کے بعد قرآن پاک کی روشنی میں ایک نظام متعین کرنے کی مساعی کی ہیں، ان کے افکار اور نظریات پر قرآن حکیم کے واضح اثرات اس امر کی نشاندہی کے غماز ہیں۔

اقبال کا نظریہ تعلیم چوں کہ ان کے نظریہ حیات سے بہت مماثلت رکھتا ہے اور یہ نظریہ بھی ان کے نظریہ خودی کے تابع ہے۔ اس لیے اقبال کے نزدیک تعلیم کا مقصد تربیت خودی، روحانی صلاحیتوں کی بہتر طور پر دیکھ بھال و نگہداشت، ان روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر ایک مثالی فرد کی تکمیل کرنا ہے جو بالآخر ایک مثالی معاشرے کے قیام میں بھرپور طور پر اپنا کردار ادا کرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ خودی کا نظریہ اساس ہے اور دیگر تمام تر نظریات عمارت (ہم فرد کو ایک عمارت کہہ سکتے ہیں) کی تعمیر میں اینٹوں، سیمنٹ، بجری اور گارے جیسا کام کرتے ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک چیز بھی موجود نہ ہو تو عمارت یا تو تعمیر نہ ہو سکے گی یا پھر اس قدر نحیف ہو گی کہ ذرا سی لرزش سے منہدم ہو جائے گی۔ اقبال کا نظریہ تعلیم اس عمارت کا جزو لاینفک ہے جس کے بغیر اس عمارت کو نہ تو استوار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اقبال کے نزدیک علم و تعلم کے راستے کا درست ہونا ضروری امر ہے۔ جن کا علم درست ہوتا ہے ان کی تکبیر میں بھی ایک انقلاب انگیز شان پائی جاتی ہے جس کے باعث کسی بھی قوم میں انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ خدا تعالیٰ درست علم والوں کو اعلیٰ درجہ پر فائز کرتا ہے۔ بالِ جبریل میں ہے

ہے تری شان کے شایاں اسی مومن کی نماز
جس کی تکبیر میں ہو معرکہ ء بود و نبود(۷)

اس معرکہ ء بود و نبود کا خمیر دراصل علم سے ہی اٹھتا ہے اور اس کی درست معلومات کے لیے نہ صرف علم کا درست ہونا ضروری ہے بلکہ تحقیقی لوازمات کا خیال رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ ہلکی سے لرزش اس معرکہ بود و نبود میں اثبات سے نفی کی طرف لے جانے کے لیے کافی ہے۔ اہلِ علم کے درجات کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورۃ المجادلہ کی آیت ۱۱ میں فرماتا ہے:

یرفع اللہ الذین اٰمنو منکم والذین واتو العلم درجٰتٍ
اللہ تعالیٰ تمہارے ایمان والوں کے اور ان کے جن کو علم دیا گیا ہے، درجات بلند فرماتا ہے

یہ علم کی فضیلت ہی ہے کہ جاہل اور عالم برابر نہیں ہوسکتے اور اہلِ علم کو دوسروں پر فوقیت حاصل ہے۔ اقبال کے نزدیک علم روحانی تربیت کا ذریعہ ہے لیکن فکر معاش اس کے ساتھ منسلک کر کے علم کی اصلیت کو داغدار کر دیا گیا ہے۔ علم کو ڈگریوں کے حصول اور حصولِ معاش کا ذریعہ بنالیا گیا ہے، اس سے مادی ترقی تو ممکن ہے لیکن اخلاقی ترقی ممکن نہیں ہے۔ اس لیے اقبال اس مادیت پرستی کی مخالفت کرتے ہیں۔ وہ ایسے مدرسوں کے بھی مخالف ہیں جن میں تربیت خودی کی بجائے حصولِ معاش کے لیے تعلیم دی جاتی ہے۔ ایسے اساتذہ سے بھی سخت نالاں ہیں جو بچے کی باطنی صلاحیتوں کی تربیت نہیں کرتے بلکہ انہیں رٹی رٹائی ہوئی چیزیں سکھا کر معاش کے حصول کے مقاصد کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ بالِ جبریل میں ہے:

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا (۸)

اقبال ایسے مدرسوں سے اس لیے بھی نالاں ہیں کیوں کہ یہ پیٹ بھرنے کے طریقے بتاتے ہین جب کہ خداوند کریم نے حقائق کی جانچ کی تعلیم دی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت ۳۱ میں ہے:

وعلم اٰدم الاسماء
اور اللہ نے آدم کو (چیزوں کے) نام سکھائے۔

گویا تعلیم کا آغاز تخلیق آدم کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ یہ وہ شے ہے جس کا انسان کی ہستی کے ساتھ براہ راست تعلق ہے۔ انسان کی تخلیق کے ساتھ ہی علم معرض وجود میں آگیا لیکن اس علم کی اساس حقیقت پر ہے۔ علم کے مراتب کا لحاظ رکھنا بھی اہل علم کے کارِ ضروری ہے۔ ابلیس نے علم و مرتبہ کی بنیاد پر غرور کیا اور شرکا رہنما بن کر رہ گیا۔ اقبال کے نزدیک اسی لیے مغرور علما کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ وہ ایسے علما کو پسند نہیں کرتے جو اپنے علم کی نمائش کرتا ہے اس کے برعکس وہ علما پر قلندر کو ترجیح دیتے ہیں جس کی نظر علما سے زیادہ عمیق ہوتی ہے لیکن غرور و تکبر نام کو نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ علما تو غرور و رفکر اور ڈر و خوف جیسے عوامل سے خوف زدہ ہو جاتا ہے، دب جاتا ہے لیکن قلندر صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تکیہ کرتا ہے اسی لیے کسی سے خوف نہیں کھاتا۔ اقبال کہتے ہیں:

قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا (۹)

اسی قلندری کے بارے میں اللہ تعالیٰ سورۃ الزمر کی آیت ۳۶ میں فرماتا ہے:

الیس اللہ بکافٍ عبدہ
کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟

قلندر کا تکیہ محض ذاتِ خداوندی پر ہوتا ہے اس لیے اس کا ایمان کسی مشکل سے متزلزل نہیں ہوتا۔ وہ اپنے آپ کو ذاتِ الٰہیہ میں اس قدر گم کر دیتا ہے کہ تمام تر پردے اس پر وا ہو جاتے ہیں۔ اسے دنیا کی کوئی پروا نہیں رہتی، اس کا مقصد محض خشیتِ الٰہی اور رضائے خداوندی کا حصول بن جاتا ہے۔ یہ اقبال کے نظریہ خودی کا انتہائی مقام ہے جہاں پر اللہ کی رضا مومن کی رضا بن جاتی ہے اور مومن کی خواہش اللہ کی مشیت بن جاتی ہے۔ اس مقام کے حصول میں جو ریاضتیں، مشکلات، اصلاح نفس و تزکیہ نفس اور تربیتِ نفس کی منازل آتی ہیں ان تک محض چند لوگ ہی رسائی حاصل کر پاتے ہیں۔ قلندر کا ہر لفظ مشیتِ ایزدی کے مطابق ہوتا ہے اور اس کا ہر عمل احکامِ الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔ اس مقام پر پہنچ کر وہ شعوری خودی کے اعلیٰ ترین درجہ پر فائز ہو جاتا ہے۔ اس کی زندگی پر احکامِ الٰہی اس طرح نافذ ہو جاتے ہیں کہ ان سے الگ نہ تو وہ رہ سکتا ہے اور نہ ہی اس کی سوچ کے زاویے اس کو سکون کی کیفیت پر منتج رہنے دیتے ہیں۔ اس کی زندگی محض رضائے الٰہی کا حصول کا ذریعہ بن کر رہ جاتی ہے۔ قرآن حکیم ایسی ہی تعلیم دیتا ہے جس میں سخت کوشی، اصلاح نفس، تزکیہ باطن اور استوارِ خودی جیسی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ سورۃ البلد کی آیت ۴ میں ایسی ہی مشقت کا بیان ہے:

لقد خلقنا الانسان فی کبدِ

بے شک ہم نے انسان کو مشقت میں رہتا پیدا کیا

گویا قرآن پاک انسان کی مشقت اور سخت کوشی کا قائل ہے۔ اللہ تعالیٰ سخت کوشی، پیکار اور سعی کو پسند فرماتا ہے۔ خدائے کریم عزم و استقلال اور باہمت لوگوں کے لیے منزل کی راہ آسان فرما دیتا ہے جب کہ راہِ منزل کی دشواریوں سے خوفزدہ لوگوں کی مدد نہیں فرماتا۔ انسان کی پیدائش کا مقصد ہی سخت کوشی ہے اور اس جذبہ سے جی چرانے والا ذاتِ خداوند کے نزدیک بلند تر کبھی نہیں ہو سکتا۔ اقبال کی سخت کوشی کا یہی نظریہ اس کے نظریہ تعلیم میں بھی کار فرما ہے۔ حصولِ علم کے لیے سخت کوشی اختیار کرنے سے نہ صرف اس علم کی افادیت و معرفت کا ادراک حاصل ہوتا ہے بلکہ اس کی قدر و قیمت بھی بڑھ جاتی ہے اور مرحلہ شوق کے طے کرنے میں عجیب لذت آفرینی کا احساس ہوتا ہے:

علم میں بھی سرور ہے لیکن
یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں(۱۰)

اقبال مرد و عورت دونوں کے لیے تعلیم کو لازم قرار دیتے ہیں۔ لیکن وہ مروجہ تعلیمی نظام سے ہٹ کر تعلیم چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں معاشرے کے لیے مشینوں کی نہیں زندہ سوچ بچار رکھنے والے، اپنے اندر اخلاقی قوتیں رکھنے والے انسانوں کی ضرورت ہے۔ اقبال ایسے نوجوانوں کے مخالف ہیں جو اپنے معاشرتی طور طریقے بھول کر مغرب کی یلغار کا شکار ہو گئے اور جنھوں نے نہ صرف اپنی ہیئت بدل لی بلکہ اندر سے بھی تبدیل ہو گئے ہیں۔ انھوں نے یورپی طرزِ زندگی اختیار کر لیا ہے جو کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتا، ایسا طرزِ زندگی جس میں اسلام کی روح تار تار ہو جاتی ہے۔ تاہم

اقبال ایسے نوجوانوں سے بھی مطمئن نہیں ہیں جنھوں نے خالصتاً مشرقی لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور مشرق کی ان روایات پر بھی سختی سے عمل پیرا ہیں جن میں تغیر کا عنصر مفقود ہے اور سکوت کی فضا طاری ہے، جو ملایت کو فروغ دے رہے ہیں، جنھوں نے تحقیق کے دروازے خود پر بند کر رکھے ہیں اور ایک متعین راستے پر چل رہے ہیں۔ وہ اہلِ دانش سے زیادہ اہلِ نظر کے متلاشی ہیں جو انہیں کہیں نہیں دکھائی دے رہے:

اہلِ دانش عام ہیں، کم یاب ہیں اہلِ نظر
کیا تعجب ہے کہ خالی رہ گیا تیرا ایاغ(۱۱)

فقط اتنا ہی نہیں بلکہ وہ شیخ مکتب کے طریقہ درس سے بھی مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے خیال مس روایت پرستی نے مدرسوں میں ایک انحطاط کی کیفیت پیدا کر رکھی ہے جس وجہ سے نظامِ تعلیم میں ایک قسم کا ٹھہراؤ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے خیال میں شیخ مکتب بجلی کا چراغ کبریت سے روشن کرنے میں مگن ہے جو کہ علم کی اصلیت نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ وہ راستے سے بھٹکا ہوا ہے۔ صرف شیخ مکتب نہیں بلکہ اقبال طالب علم سے بھی نالاں ہیں، ان کے خیال میں جب تک نوجوانوں میں خودی پیدا نہیں ہو گی اس کے اندر کی صلاحیتیں بیدار نہیں ہو سکیں گی، صرف سبق یاد کر لینے سے خفتہ صلاحیتیں بیدار نہیں ہوتیں بلکہ اس کے لیے محنت، ہمت، کاوش اور تحقیق کی ضرورت ہے جس سے آج کا نوجوان غافل ہے، ضربِ کلیم میں شامل نظم "طالب علم" میں اقبال نے کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا ہے:

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں(۱۲)

اقبال چاہتے ہیں کہ نوجوان درست علم حاصل کریں اور اس کا اطلاق عملی زندگی پر کریں، علم برائے حصول روزگار نہ ہو بلکہ تحصیل علم کا مقصد تربیت خودی ہو اور اس تربیت میں کامیابی ہی معاشرے کی اصلاح کا باعث بن سکتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہی تعلیم اس کے لیے روزگار کے حصول کا سبب بھی بنتی ہے اگرچہ کہ روزگار اس کی تعلیم کا مقصدِ اولیٰ نہ ہو بلکہ ثانوی مقصد ہو۔ اقبال کے خیال میں مرد پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ گھر کے لیے روزی کا بندوبست کرے، دفاتر میں کام کرنا مردوں کو زیب دیتا ہے عورت کو نہیں اور اسلام کی تعلیمات بھی یہی ہیں، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

الرجال قوامون علی النساء — مرد غالب ہیں عورتوں پر

اقبال عورت کو حق دینے کے مخالف بالکل نہیں ہیں بلکہ وہ تو اس خیال کے مخالف ہیں کہ عورت کو مردوں کے

برابر لا کھڑا کر دیں اور دفاتر میں ایک شو پیس کے طور پر سجا کر کھڑا کر دیں کیوں کہ اگر عورت بھی مرد کے ساتھ دفتروں میں کام کرے گی تو نسلِ نو کی تربیت کا ذمہ کون اٹھائے گا اور ایک عمدہ اور بہترین قوم کی تشکیل کس طرح ممکن ہو گی۔ اقبال ایسی تعلیم کے مخالف ہیں جس نے عورت کو ایک نمائشی چیز کے طور پر پیش کیا ہے اور اپنے حقیقی مقاصد سے روگرانی کی ہوئی ہے، ان کے خیال میں فرنگی قوم نے عورت کو شو پیس بنا کر دفتروں میں بٹھا دیا ہے جس کی نقالی میں ہمارے معاشرہ میں عورت کو دفتر میں بٹھا کر کام کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اقبال نقالی کے بھی خلاف ہیں کیوں کہ یہ ضعفِ خودی کا باعث بنتی ہے۔ اقبال عوت کو فرنگی تہذیب کی پیروی میں دفتروں میں کام کرنے سے اس لیے بھی روکتے ہیں کہ اس طرح عورت اپنے فرائض منصبی سے غافل ہو جاتی ہے اور اس میں خدا تعالیٰ نے جو خاصیتِ نسوانیت رکھی ہوئی ہے وہ بھی معدوم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اقبال کے ہاں عورت کی تعلیم کی یکسر مخالفت نہیں ہے بلکہ ایسی تعلیم کی مخالفت ہے جو آئندہ نسل کی تربیت میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔

جب کوئی تہذیب، معاشرہ یا قوم تشکیل پاتی ہے یا معرضِ وجود میں آتی ہے تو اس کی تشکیل و ترتیب کے عناصر کو اس کے ساتھ باہم مربوط کیا جاتا ہے تاکہ مستقبل میں وہ تہذیب، معاشرہ یا قوم نہ صرف اپنے نصب العین کو ظاہر کر سکے بلکہ مکمل طور پر اس پر عمل پیرا ہو کر اس کی ترویج بھی کر سکے۔ اقبال کا قومیت کا نظریہ اپنے اندر بہت جداگانہ خصوصیات رکھتا ہے جو اسلامی معاشرے کی تہذیب و تمدن، اس کی جغرافیائی حدود سے ماورا تحفظ اور اتحاد عالم اسلام کا علم بردار ہے۔ اسلامی تہذیب کا سب سے منفرد پہلو یہ ہے کہ دنیا کے کسی بھی خطہ میں بسنے والے مسلمان ایک قوم ہیں، اس میں لسانی، جغرافیائی، معاشرتی، تہذیبی، معاشی و سماجی عوامل کو پس پشت ڈال کر صرف اسلام کو ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ اقبال کا یہ نظریہ خاصا دل چسپ اور وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

اقبال کا نظریہ قومیت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن عہدِ حاضر میں اگر بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو عرب عربی، پاکستان والے پاکستانی، ہندوستان والے ہندی، ایران کے باسی ایرانی، مصر کے رہائشی مصری، شام کے شامی اور افغانستان کے باشندے افغانی تو کہلانا شروع نہیں ہو گئے۔ یقیناً کچھ ایسا ہی ہے۔ اقبال کا نظریہ قومیت جس میں دنیا بھر کے مسلمان ایک جماعت بن کر ابھرتے ہیں، سب کے مفادات و نقصانات یکساں ہیں، کہیں وطنیت کے اس نظریہ کے زیر آ کر اپنی حقیقت کھو تو نہیں رہا جس کا مطمح نظر مذہبی حدود نہیں بلکہ جغرافیائی حدود پر قائم رہ کر نہ صرف بے چینی و انتشار کا شکار ہونا ہے بلکہ اتحاد مسلم کے خواب کو بھی چکنا چور کر دینا ہے۔ عہدِ حاضر میں وطنیت کا نظریہ جس کی اساس جغرافیائی حدود پر ہے اقبال کے نظریہ قومیت کو خاصا نقصان پہنچانے کا سبب بن رہا ہے۔ اسلام ایک بہت بڑی طاقت ہے لیکن اس کو کمزور کرنے کے لیے جغرافیائی حدود متعین کر دی گئی ہیں، یہی وہ چیز ہے جو اقبال کو پریشان کر رہی تھی اس لیے انھوں نے قومیت کو کسی مخصوص علاقے، فرقے، شہر یا ملک کی حدود سے ماورا کر کے اس کی بنیاد مذہب پر رکھ دی۔ تاہم کفار کی

سازشوں نے اس نظریہ قومیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے ہیں۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اقبال کے نظریہ قومیت کا اطلاق عہدِ حاضر پر کیسے ہو سکتا ہے جو کہ امتِ مسلمہ کے پریشان کن حالات میں وقت کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

اس امر کی ابتدا کے لیے ضروری ہے کہ اقبال کی تعلیمات اور ان کے افکار سے عام شخص تک کے مستفیض ہونے اور ان کے اذہان میں نشین کرانے کے اقدامات کیے جانے چاہئیں، اس سلسلہ میں اسکولز، کالجز اور جامعات میں تصوراتِ اقبال سے متعلق ایک مضمون شاملِ نصاب ہونا ضروری ہے۔ اب سوال یہ اٹھتا ہے کہ اگر ایسا ہو بھی جائے تو اقبال کی آواز، ان کی تعلیمات کا دائرہ کار تمام دنیا تک کیسے پہنچ پائے گا۔ اقبال کی تعلیمات چوں کہ کسی خاص خطہ یا کسی خاص وقت کے لیے مخصوص نہیں ہیں لہٰذا دنیا بھر میں ان کی تعلیمات کی ترویج کوئی ناممکن عمل نہیں ہے۔ اس کے لیے سفارتی سطح پر تعلقات استعمال کر کے مسلم ممالک کی بین الاقوامی جامعات میں اقبالیات کو بطور مضمون شامل کرایا جا سکتا ہے۔ یہیں سے اس انقلاب کی ابتدا ہو سکتی ہے جو تمام عالمِ اسلام کو یکجا کرنے کا باعث بن سکتا ہے۔ دنیا کے تمام مسلمانوں پر تعلیمات اقبال کے ذریعہ باور کرانا ضروری ہے دنیا کے کسی بھی خطہ کے مسلمان ایک ہیں، اس لیے سب کے مفادات اور نقصانات بھی یکساں ہیں۔ جغرافیائی بنیادوں پر قائم ترجیحات کو ختم کر کے اسلام کو بنیاد بنا کر برابری کا یکساں پیمانہ بنانا ہو گا۔ ایک دوسرے کے وسائل سے استفادہ کر کے مسائل حل کرنا ہونگے۔ نحیف و لاغر ممالک میں اور ان کے باسیوں میں آپسی اتحاد و یگانگت سے ایک نئی روح پھونکنا ہو گی۔ مسلمانوں کو اپنی بقا کے لیے ایک ایسی تنظیم کی ضرورت ہے جو دنیا کے کسی بھی خطہ میں رہنے والے مسلمانوں کے جان و مال اور ان کے تشخص کی حفاظت کر سکے۔ افکارِ اقبال کے ذریعہ نوجوان نسل میں خودی پیدا کی جا سکتی ہے اور ان میں شعوری طور پر ایسی بیداری پیدا کی جا سکتی ہے جس کے نتیجہ میں ایک مثالی معاشرے کے قیام میں مدد ملے گی۔ یہی خودی جب اجتماعی خودی (بے خودی) کی صورت میں نمودار ہو گی تو دنیا بھر کے مسلمانوں کی حفاظت کر سکے گی۔ ابلیس کی جماعت کی سازشیں عیاں کرے گی اور مکروہ چہروں سے نقاب الٹ دے گی اور جب اقبال کا مردِ مومن اپنی تمام تر خصوصیات کے ساتھ جلوہ افروز ہو گا تو کفار کے قدم اس کی ہیبت سے خود بہ خود تھم جائیں گے اور کائنات مسخر ہونے کے لیے بے تاب ہو جائے گی۔

مندرجہ بالا تمام عوامل اپنی جگہ درست ہیں لیکن سب سے پہلے ہمیں اپنے آپ سے تبدیلی شروع کرنا ہو گی کیوں کہ تبدیلی ایک فرد سے شروع ہوتی ہے اور پھر اس کا دائرہ کار لامحدود ہوتا جاتا ہے۔ اقبال کی تعلیمات بھی یہی ہیں۔ وہ ایک فرد سے تبدیلی شروع کر کے اس کا اطلاق تمام معاشرے پر کرنے کے خواہاں ہیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب اقبال کے افکار تک رسائی ہر خاص و عام کو ہو گی۔ اقبالیات کے فروغ کے لیے اقدامات کرنا وقت کی اہم ترین ضرورت ہے کیوں کہ معاشرہ جس تیزی سے مغرب کی یلغار کا شکار ہو رہا ہے اور روشن خیالی کے نام پر اسلامی افکار کی جس

طرح دھجیاں بکھیری جارہی ہیں اس کی روک تھام اسی صورت میں ممکن ہے کہ تعلیماتِ اسلامی سے استفادہ کیا جائے، اقبال اس سلسلہ میں ایک اہم ترین کڑی ثابت ہوسکتے ہیں کیوں کہ ان کے افکار محض فلسفہ، مذہب، دین یا تاریخ پر بحث نہیں ہیں بلکہ انسان کو حقیقت سے روشناس کرانے کا ایک ذریعہ بھی ہیں۔ اقبال نے اپنے افکار میں دین اسلام کو اس طرح پیش کیا ہے کہ روحانیت کی روح بھی مسخ نہیں ہوئی اور اس خطہ کے طبعی رجحانات و میلانات کا بھی خیال رکھا ہے تاکہ وہ درست طور پر بہرہ مند ہو سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنے ابلاغ کے لیے نثر کی بجائے نظم کو اپنا وسیلہ اظہار بنایا۔ برعظیم کے لوگوں کا طبعی میلان نظم کی طرف تھا اس لیے ایک ہلچل مچ گئی۔ اب موجودہ دور میں اس خطہ کے لوگوں کے میلان کو پیش نظر رکھتے ہوئے افکارِ اقبال کی تبلیغ سے نہ صرف مسلم معاشرہ اپنا توازن قائم رکھ سکتا ہے بلکہ اقوامِ عالم پر بھی اپنا تشخص بہتر طور پر اجاگر کرنے کا اہل ہو سکتا ہے۔ اقبال نے تمام عمر اسلامی شعار کی تبلیغ کو مقصدِ حیات بنا کر رکھا اور تصوف و فلسفہ کی پیچیدگیوں کے باوجود اسلام کا تشخص مجروح نہ ہونے دیا۔ دورِ حاضر میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اقبال کی فکر کو عام فرد تک رسائی دینے کے لیے اقدامات کیے جائیں تاکہ ایک تشکیل شدہ معاشرہ درست طور پر اپنے تشخص کی حفاظت کر سکے۔

حوالہ جات

۱۔ جاوید اقبال، ڈاکٹر، افکارِ اقبال، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۵ء، ص:۲۶
۲۔ محمد عثمان، اقبال کا فلسفہء خودی، لاہور: مکتبہ جدید، ۱۹۷۱ء، ص:۱۹۸
۳۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو)، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، طبع ہشتم، ۲۰۰۷، ص:۵۴۶
۴۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص:۲۰۷
۵۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، افکار اقبال، ص:۱۰۹
۶۔ احمد خان، محمد، اقبال اور مسئلہ تعلیم، لاہور: مطبع عالیہ، ۱۹۷۸ء، ص:۱۱۱
۷۔ اقبال، علامہ محمد، کلیاتِ اقبال (اردو)، ص:۶۱۷
۸۔ ایضاً، ص:۳۶۸
۹۔ ایضاً، ص:۳۶۸
۱۰۔ ایضاً، ص:۳۷۵
۱۱۔ ایضاً، ص:۳۷۸
۱۲۔ اقبال، علامہ محمد، ضربِ کلیم، طبع چہارم، لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۴۴، ص:۸۱